© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

اشارات

مذہب و سائنس کی باہمی آویزش کی اندوہناک داستان اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس دلفگار حادثہ سے ملتی جلتی ہے جسے فردوسی نے اپنی زندہ جاوید کتاب شاہنامہ میں قلمبند کیا ہے۔ دونوں آمادۂ جنگ و پیکار ہیں لیکن ایک دوسرے سے بے خبر۔ اگر وہ ایک دوسرے کو بروقت پہچان لیتے تو یہ ہولناک سانحہ اور یہ اہم ٹریجڈی واقع نہ ہوتی۔

پھر جس طرح رستم و سہراب کے معاملے میں راز افشا ہونے پر رستم نے افراسیاب کے پاس دستگیری کی درخواست کی لیکن اُس کی ذاتی مصلحتیں اُس کے احساسِ مردہ کو جگا نہ سکیں بالکل اسی طرح اب جبکہ اہلِ سائنس اور اہلِ مذہب ایک دوسرے کو سمجھ چکے ہیں اور انہیں اس بات کا یقین آچکا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے دشمن نہیں بلکہ دمساز رفیق اور دوست ہیں تو عین اس وقت بھی عصرِ حاضر کے افراسیاب ان دونوں کو گلے نہیں ملنے دیتے اور اس امر کے لیے برابر کوشاں ہیں کہ کسی طرح ان کے درمیان بیگانگی قائم رہے تاکہ اُن کی سطوت اور شوکت میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔

آج سے پانچ سو برس پیشتر جب مسلم فاتحین نے یورپ میں قدم رکھا تو اہلِ یورپ کی عقل و خرد کو مہمیز لگی اور انہوں نے کائنات کے بارے میں سوچنا اور غور کرنا شروع کیا۔ بیداری کی یہ لہر اپنے نتائج کے لحاظ سے دنیا کے لیے بڑی مفید اور کارآمد ہوتی اگر یورپ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیتھولک پادری اس کا راستہ روکنے کی حماقت نہ کرتے۔ اس سے انسانی عقل کے جمود و ارتقاء پر جو فضول بندشیں اور پابندیاں عائد تھیں وہ دور ہو تیں اور انسان ایک بہتر اور شاد کام زندگی گزارنے کے قابل ہوتا مگر افسوس کہ ان مذہبی پیشواؤں نے کچھ تو اُس تحریف کی وجہ سے دھوکا کھا کر جس نے تورات و انجیل کی سماوی اصلیت کو پایۂ اعتبار سے ساقط کر دیا تھا، کچھ اُس جہالت کے آفتضاء سے جو قرنہا قرن سے ان پادریوں کا سرمایۂ امتیاز بنی ہوئی تھی اور کچھ اُن سیاسی ضرورتوں سے مجبور ہو کر جنہوں نے اُن کے دین کو دنیا داری میں تبدیل کر دیا تھا اُن باتوں میں بھی دخل دینا شروع کر دیا جن سے انہیں کوئی علاقہ اور سروکار نہ تھا۔

عوام کے لیے ان مذہبی رہنماؤں کی یہ جسارت کچھ زیادہ قابلِ اعتراض نہ ہوتی اگر یہ حضرات کچھ مزید حماقتیں نہ کرتے۔ جب یہ لوگ سائنس کے میدان میں اترے تھے تو اُن کا فرض تھا کہ یہ سائنس دانوں ہی کی طرح اپنی تحقیقات اور انکشافات لوگوں کے سامنے پیش کرتے اور جو کچھ کہتے تجربات اور مشاہدات کو اس پر گواہ بناتے لیکن انہوں نے اپنے اُس بلند و بالا مقام کے زعم میں جو انہیں معاشرہ میں حاصل تھا، سائنس کے مسائل پر بھی ملہم من اللہ کی حیثیت سے رائے زنی شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ حقائقِ فطرت کے متعلق جب انسان کو صحیح صحیح علم ہُوا تو ان مذہبی رہنماؤں کے دعاوی اور من گھڑت تصورات جنہیں الہام سے کوئی لگاؤ نہ تھا باطل ہو گئے اور اُن کے پیرو اُن کو جھوٹا سمجھ کر کفر و الحاد کی طرف جھک گئے اور مغربی دنیا بڑی حد تک مذہب کی قید سے آزاد ہو گئی۔

اگر معاملہ صرف اس حد تک ہی محدود رہتا تب بھی کچھ بہت زیادہ تشویشناک نہ تھا۔ لیکن اہلِ کلیسا کی مزید حماقتوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ یہ لوگ وقتی فائدہ اور نقصان میں اتنے کھو چکے تھے کہ اپنی خلافِ عقل حرکات کے دُور رس نتائج کی طرف سے انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور ہر نئی آواز کو بلا سوچے سمجھے دبانا شروع کر دیا اور اس نئی تحریک کا راستہ روکنے کے لیے وہ وہ حربے استعمال کیے اور اتنی سختیاں کیں کہ ان کے تصور سے آج بھی جسم ورح دونوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کانپ جاتے ہیں۔ مذہبی عدالتیں قائم ہوئیں جن میں ان "باغیوں" کو عبرتناک سزائیں دی گئیں۔ اندازہ ہے کہ اس محکمہ نے جن لوگوں پر عتاب نازل کیا اُن کی تعداد کسی طرح بھی تین لاکھ سے کم نہیں۔ ان میں سے بتیس ہزار کو زندہ جلا دیا گیا، انہی زندہ جلائے جانے والوں میں ہیئت وطبیعیات کا مشہور عالم برونو بھی تھا جس کا سب سے بڑا جرم اربابِ کلیسا کے نزدیک یہ تھا کہ وہ اس کرہ ارض کے علاوہ دوسری دنیاؤں اور آبادیوں کا بھی قائل ہے۔ اسی طرح مشہور طبیعی عالم گلیلیو کو اس بنا پر موت کی سزا دی گئی کہ وہ زمین کے سورج کے گرد گھومنے کا قائل تھا۔

اہلِ کلیسا کے ان لرزہ خیز مظالم اور چیرہ دستیوں نے یورپ میں مذہب کے خلاف نفرت کی ایک عام لہر دوڑا دی اور لوگ بڑی سرعت کے ساتھ مذہب سے بغاوت کرنے لگے۔ اور وہ جنگ جو شروع شروع میں تنگ نظر اور عیاش قسم کے اہلِ کلیسا کے خلاف لڑی جا رہی تھی وہ بعد میں عیسائی مذہب کے خلاف شروع ہو گئی اور اس کے بعد ہر مذہب کے خلاف۔ مذہب کے ان باغیوں نے وقتی جوش اور ہیجان میں اتنا سوچنا بھی گوارا نہ کیا کہ ان اربابِ کلیسا کی حماقتوں کا خود مذہب سے کہاں تک تعلق ہے۔ یہ ہیں وہ اصل حالات جن میں پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں ایک ایسی جذباتی کشمکش شروع ہوئی جس میں چڑ اور ضد نے اربابِ کلیسا کے خلاف جذبات کو بڑے ہی غلط راستوں پر ڈال دیا۔ اس نئی تحریک کے علمبرداروں نے کائنات کی بدیہی شہادتوں کے باوجود زندگی کی ساری عمارت کو اس بنیاد پر کھڑا کرنا چاہا کہ دنیا میں جو کچھ ہے وہ صرف مادہ ہے، نمو، حرکتِ ارادی، احساس، شعور اور فکر سب اسی ترقی یافتہ مادہ کے خواص ہیں۔ حیوان اور انسان سب کے سب مشینیں ہیں جو قوانینِ طبیعی کے تحت چل رہی ہیں۔ ان مشینوں کے پرزے جس طور ترتیب پاتے ہیں اسی قسم کے افعال ان سے سرزد ہوتے ہیں۔ تہذیبِ جدید کے معماروں نے اسی بنیادی فلسفہ کو سامنے رکھ کر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی عمارت تعمیر کی اور اس کا آغاز اس مفروضہ سے کیا گیا کہ کوئی خدا نہیں، کوئی الہامی ہدایت نہیں، کوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واجب الاطاعت نظامِ اخلاق نہیں، کوئی حشر نہیں اور کوئی احتساب و جوابدہی نہیں۔ جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان سب کے سب قوانینِ طبیعی کے پابند ہیں۔

مغرب کا نیا انسان بڑے جوش اور ولولے کے ساتھ اور اس عزم کے ساتھ میدان میں اترا کہ وہ زندگی کے سارے مسائل کو قوانینِ طبیعی کی مدد سے نہایت کامیابی سے حل کر لیگا۔ چنانچہ اُس نے سب سے پہلے انسان کو اس بات کی ترغیب دینا شروع کی کہ یہ حشر و نشر، اخلاق اور خدا پرستی سب اعتباری باتیں اور دورِ جہالت کی یادگار ہیں۔ اس لیے اُسے سب سے پہلے انہیں اپنے دل و دماغ سے محو کر دینا چاہیے۔ اُس کی طبیعت جس بات کا تقاضا کرے، اُس کا نفس جس چیز کا مطالبہ کرے اُس کے پورا کرنے میں کوئی شے بھی مانع نہ ہونی چاہیے۔ مصنفین اور اہلِ قلم نے قلم کے زور سے، سوچنے اور سمجھنے والے دماغوں نے فلسفہ کی مدد سے، اور اہلِ خطابت نے اپنی جادو بیانی، سحر طرازی اور زورِ خطابت سے قدیم مذہبی رسوم اور قیود کے خلاف ملک میں نفرت اور بغاوت کی ایک عام فضا پیدا کر دی۔ انہوں نے دنیا پرستی کو نہایت ہی دلفریب بنا کر پیش کیا، جو چیز اس کی راہ میں حائل ہوئی اس کے خلاف غیظ و غضب کا جذبہ بھڑکایا اور اس طرح طبیعتوں کو ہر قسم کی حدود و قیود سے آزاد کر دیا۔ انہوں نے لوگوں کو زندگی سے بھرپور تمتع، مطالباتِ نفس کی بے عنان تکمیل اور لذت پرستی کی علانیہ دعوت دی۔ حرص و آز کی اس زندگی کی اہمیت جتانے میں بڑے غلو سے کام لیا گیا، نقد لذت اور ظاہری اور محسوس مادی نفع کے سوا ہر چیز کا ابطال کیا گیا۔ نقطۂ نظر کی اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان نے کسی بلند تر اخلاقی مقصد کے تحت زندگی بسر کرنے کی بجائے صرف جبلتوں کی تحریک اور اُن کی رہنمائی میں سفرِ حیات کا آغاز کیا اور اسی کو انسانیت کی معراج سمجھنے لگا۔

عین اسوقت جب انسان اس احمقانہ مہم پر نکلنے کے لیے رختِ سفر باندھ رہا تھا قدرت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُس کی اس حماقت پر خندہ زن تھی اور زبانِ حال سے کہہ رہی تھی کہ یہ بے راہ روی کی زندگی اور جبلتوں کی یہ بے قید پرستش تیری فطرت کے عین منافی ہے اور تو اس حالت میں ایک لمحہ بھی گزار نہیں سکتا۔ لیکن انسان نے وقتی جوش میں آکر قدرت کے ان خاموش اشاروں سے صرفِ نظر کیا اور قوانینِ طبیعی کو مشعلِ راہ بنا کر ان کی روشنی میں اپنے انفرادی اور اجتماعی مسائل کو حل کرنے کے لیے جدوجہد شروع کی۔ اس کی یہ جدوجہد چونکہ فطرت کے خلاف کھلا چیلنج تھی اس لیے اسے قدم قدم پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے ہر گام پر ٹھوکر کھائی۔ قدرت نے ترغیب و ترہیب دونوں طریقوں سے اس کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ ہر ہر منزل پر نہایت تلخ نتائج سے اُسے دوچار کر کے اس کے لیے سامانِ عبرت مہیا کیا۔ لیکن انسان نے ان سب چیزوں سے مجرمانہ تغافل برتا اور اپنی روایتی لاپروائی کے ساتھ انحطاط کی طرف مسلسل بڑھتا رہا۔ یہ چیز غالباً انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ جب ایک مرتبہ بربادی کی طرف لڑھکتا ہے تو پھر کوئی آواز، کوئی نصیحت اُس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ اس کی آنکھیں پھر انحطاط کی آخری حد تک پہنچنے کے بعد ہی کھلتی ہیں۔

انحطاط کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ اُس کے چھا جانے کے بعد ایک فرد اور قوم کے اندر ایک عجیب و غریب قسم کا تضاد پیدا ہو جاتا ہے جو اسے قدم قدم پر پریشان کرتا ہے۔ اس تضاد سے بلاشبہ فرد اور معاشرے کو بہت زیادہ نقصان پہنچتا ہے لیکن اس کا وجود کسی قوم کے لیے بڑا ہی غنیمت ہوتا ہے۔ یہ تضاد خطرے کا وہ نشان ہے جو حساس اقوام کو چونکاتا ہے اور انہیں اُس خطرہ سے آگاہ کرتا ہے جس کی آغوش میں وہ بڑی تیزی سے جا رہی ہوتی ہیں۔

اہلِ مغرب جب کفر اور الحاد کی راہوں پر چلنے لگے تو انہوں نے سب سے پہلے اس بات کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فیصلہ کیا کہ وہ اب کسی مذہب کی پیروی نہیں کریں گے لیکن قدرت نے اُن سے ایسے ایسے ظالمانہ نظاموں کی پیروی کرائی جن کا کوئی شخص اُس وقت تک وہم و گمان بھی نہ کر سکتا تھا۔

پہلے ہی قدم پر جو اُلجھن انہیں پیش آئی وہ یہ تھی کہ وہ اپنی جبلتوں کی بالکل آزادانہ طور پر تسکین کرنا چاہتے تھے۔ لیکن خود ان کی اپنی شخصیت اس راہ کا سب سے بڑا سنگِ گراں ثابت ہوئی۔ جبلتوں کی بے قید تسکین تو جانوروں کا شیوہ ہے جن میں کوئی شعور و آگہی یا ارادہ و اختیار نہ ہو۔ مگر انسان اس موقف کو اختیار کر کے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی معاشرتی زندگی قائم نہیں رکھ سکتا۔ انسانی شخصیت کا استحکام اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ عمل کے تنوع میں کسی متحد کرنے والے حقیقت کے نقطہ کو معلوم کرنے کی کوشش کرے جس سے تعدد و تنوع میں ہم آہنگی پیدا ہو اور زندگی ابن الوقتی اور بے اصولے پن کی بھول بھلیاں میں پھنسنے نہ پائے۔ انسان کی یہ تلاش دراصل اُس کے روحانی جذبہ کا بالکل فطری تقاضا تھا جو اُسے بار بار اس بات کی طرف متوجہ کر رہا تھا کہ وہ ان منہ زور جبلتوں کو کسی بلند و بالا مقصد کے پیشِ نظر کنٹرول کرے۔

اس کے بعد دوسرے قدم پر اُس کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر اُسے اپنی ان بکھری ہوئی قوتوں کو کسی بالاتر مقصد کا پابند ہی بنانا ہے تو وہ مقصد کیا ہو؟ خدا کی رضا جوئی تو اُس کے نزدیک محض فریبِ نظر اور جہالت کی یادگار تھی جسے وہ کسی صورت میں بھی اپنانے پر آمادہ نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے اُس نے یہ مقصد بھی مادی دنیا ہی میں متعین کیا اور اس بات کا فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی ان قوتوں کو اگر آزادانہ استعمال نہیں کر سکتا اور اجتماعی تقاضوں کے پیشِ نظر انہیں کسی نظام کا پابند بنانا بھی ناگزیر ہے تو پھر اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ وہ ان کی اس طریق سے منصوبہ بندی کرے جس سے ملک اور قوم کو زیادہ سے زیادہ مادی فائدہ حاصل ہو۔ چنانچہ اُس نے اشتراکِ زبان، اشتراکِ نسل اور اشتراکِ وطن سے ریاست کی شکل میں اپنا ایک ایسا معبود تیار کیا جس کے قدموں میں اُس نے اپنی ہر قیمتی سے قیمتی چیز کو لا ڈالا۔ اُس کے ساتھ اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعلق کی نوعیت بالکل وہی تھی جو ایک خدا پرست انسان کو اپنے خالق اور مالک کے ساتھ ہوتی ہے۔ اُس کا جینا اور مرنا صرف ریاست کے لیے مخصوص ہو گیا۔ اُس نے اگر مانگا تو اُسی سے مانگا اور وہ اگر جھکا تو صرف اُسی کے سامنے جھکا اور اس طرح وہ مملکت جو محض اعتباری اور مجازی طور پر متقدر رہی ہے اس میں اس آزادی پسند انسان نے الوہیت کی شان پیدا کر لی۔ دوسرے لفظوں میں جس خدا سے نجات پانے کے لیے اُس نے اتنے ہاتھ پاؤں مارے تھے اُسے تو اُس نے بلا شبہ روزمرہ کے معاملات سے بے دخل کر دیا لیکن اپنے ذہن سے احساسِ عبودیت کو مٹا نہ سکا اور اسی کے تقاضوں نے اسے اس بات پر مجبور کیا کہ وہ مملکت کے پیکرِ محسوس کو کبریائی کے مقام پر رکھ کر اُس کے سامنے سجدہ ریز ہو۔ اس سے بڑا تضاد اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ انسان جو خالق اور مالک کی فرمانروائی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا وہ آج دیوانہ وار اپنے آپ کو ریاست کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کے لیے آگے بڑھ رہا ہے۔

ممکن ہے ہماری ان گزارشات کو دیکھ کر کوئی صاحب یہ کہیں اب تو انسان رنگ و نسل و وطن کی حدود سے باہر نکل کر انسانیت کی وسیع سطح پر سوچ رہا ہے۔ اس لیے ہمارا یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ہم اسی قدر گزارش کریں گے کہ انسان کی انسانیت نوازی کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرنے کے لیے یہ دیکھیے کہ فکر و نگاہ کی اس تبدیلی کے محرکات کیا ہیں۔ کیا انسان نے مادی فوائد سے بلند ہو کر انسانیت کی تعمیرِ نو کا منصوبہ بنایا ہے؟ جب کوئی انسان اس نقطۂ نظر سے حالات کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے سخت مایوسی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زمین کے مختلف گوشے سمٹ کر ایک دوسرے کے قریب آ گئے ہیں اور اب پوری دنیا ایک ناقابلِ تقسیم وحدت کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ لیکن یہ معاملہ صرف تسخیرِ مکان کی حد تک ہی محدود ہے۔ اس تبدیلی نے انسان کے اذہان و قلوب کے اندر کسی قسم کا کوئی خوشگوار انقلاب پیدا نہیں کیا۔ جغرافیائی حد بندیوں کے ختم ہو جانے کی وجہ سے اُس نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب تہذیب و معاشرت کی بنیاد پر وسیع ترحجتہ بندیوں کا پروگرام مرتب کیا ہے لیکن اُس کے اس پروگرام کے اجزائے ترکیبی بالکل وہی ہیں جو پہلے تھے ۔ یہاں بھی اُس کے پیش نظر سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ وہ کسی طرح اپنے اور اپنے دھڑے کے لوگوں کے لیے زیادہ سے زیادہ مالی منفعتیں حاصل کرے ۔ مادی وسائل و اسباب جمع کرنے کے علاوہ اس کا کوئی دوسرا مقصد نہیں ۔ اس صورتِ حال نے اُسے ایک شدید قسم کے تضاد میں گرفتار کر دیا ہے ۔ آج کا انسان ایک طرف مسخرِ کائنات کے منصوبے بنا رہا ہے اور اپنے صنعتی کمالات و عجائبات اور مادی و طبیعی قوتوں سے کام لینے کے معاملے میں وہ مافوق البشر ہے مگر دوسری طرف اپنے اخلاق و اعمال میں اور اپنی حرص و طمع ، تنگ دلی اور بے دردی میں اس کی سطح چوپایوں اور درندوں کی سطح سے کسی طرح بھی بلند نہیں اور بقول ایک مشرقی فلسفی اُس نے ہوا میں اُڑنا تو سیکھ لیا ہے لیکن اُسے زمین پر چلنا نہیں آیا۔

فکر و عمل کے اس کھلے ہوئے تضاد نے اُس کی زندگی کو ایک عجیب و غریب اُلجھن میں ڈال دیا ہے ۔ ایک طرف دولت کی فراوانی اور کثرت ہے مگر دوسری طرف افلاس اور عسرت کے ایسے روح فرسا واقعات بھی ملتے ہیں جنہیں دیکھ کر انسانی عقل یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی کہ نوعِ بشری نے ایک قدم بھی ترقی کی راہ پر اٹھایا ہے ۔ اخبارات میں آئے دن نئے نئے معاہدات کی خبریں آتی ہیں اور انسان سوچنے لگتا ہے کہ انسان اب جنگ و جدال کو خیرباد کہہ کر ایک پُرامن زندگی اختیار کرنے کے لیے بیتاب ہے اور عنقریب اُس کی یہ آرزو پوری ہو جائے گی ۔ لیکن عین اُس وقت جب وہ امن کی قسمیں کھاتا ہے اور جنگ نہ کرنے کے عہد و پیمان باندھتا ہے وہ دل ہی دل میں یہ بھی سوچتا ہوتا ہے کہ فریق مخالف کو کس طرح تباہ و برباد کیا جائے ۔ اس طرح بین الاقوامی امن کی ساری کوششیں سیاسی مکر و فریب اور بدعہدیوں میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں ۔ پوری دنیا کو کنٹرول کرنے والا انسان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنی ایک معمولی سی خواہش کو کنٹرول کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

اہلِ مغرب چونکہ سائنس ہی کو وہ کلید سمجھتے ہیں جس سے اُن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سارے باب خود بخود کھل سکتے ہیں۔ اس لیے مغربی مفکرین نے جب کبھی اپنی سیاسی اور معاشی زندگی کے اس کھلے ہوئے تضاد کو دیکھا تو انہوں نے قوانینِ طبیعی ہی سے معاشرتی اور اخلاقی قوانین اخذ کرکے انسان کی خارجی زندگی میں ایسی تبدیلیاں کرنے کی کوشش کی، جو ان کی داخلی کیفیات کو ان کے خیال میں بدل دینے کی قدرت رکھتی تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ خارجی نظام مثلاً نظامِ حکومت، نظامِ معیشت یا نظامِ تعلیم انسانی کردار و افعال پر بڑے گہرے اور دیرپا اثرات مرتب کرتے ہیں لیکن جب تک انسانی ضمیر اور انسان کے باطنی محرکات میں کوئی انقلاب پیدا نہ ہو خارجی نظام کی تمام طاقت و اثر فرمائی رائیگاں ثابت ہوتی ہے۔ اصلی اور حقیقی انقلابِ حال اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب زندگی کے متعلق انسان کا مجموعی نقطۂ نظر بدل جائے۔ نیکی اور خیر کی طرف میلان کوئی ایسی چیز نہیں جسے خارج سے عائد کردہ نظام کے ذریعہ پیدا کیا جا سکتا ہو۔ لیکن قوانین طبیعی کے پرستار انسان نے اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے حق و انصاف، مساوات اور راست کرداری پیدا کرنے کے لیے بھی خارجی محرکات پر تکیہ کیا۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم پر جب اُس کے دل نے خون کے آنسو بہائے اور اُس نے اِس لعنت کو دنیا سے ختم کرنے کا ارادہ کیا تو اس کے لیے اُس نے جو تدابیر اختیار کیں وہ بالکل ادھوری اور ناقص ہیں۔ وہ یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ اشتراکی نظام قائم ہوتے ہی انسان کے فکر و نگاہ کے زاویے از خود بدل جائیں گے اور صرف دولت کی مساوی تقسیم انسان کو انصاف پسند اور راست کردار بنا دے گی۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے اُس نے اس آزاد منش انسان کو جو مذہب کی معمولی سے معمولی گرفت بھی گوارا نہ کرتا تھا اور اپنی نفسانی خواہش پر کسی قسم کی پابندی عائد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا اُسے ایک ایسے قاہرانہ اور ظالمانہ نظام کے حوالہ کر دیا ہے جس نے نہ صرف معاشرے میں تقسیمِ دولت اور پیدائش دولت کی منصوبہ بندی کی ہے بلکہ اُس کے جذبات اور میلانات تک کو جکڑ کر رکھ دیا ہے۔ جو نظامِ حیات پولیس اور فوج کی مدد سے لوگوں کے احساسات کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کا عزم رکھتا ہو اُس کی قہرمانیوں کا آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ اس نظام کو برپا کرنے والے اور چلانے والے وہ لوگ ہیں جن کا مزاج ہوس پرستی کے خمیر سے اٹھایا گیا ہے اور اس پر وہ کسی پابندی کے بھی قائل نہیں۔

اشتراکی ممالک کے برعکس سرمایہ دارانہ ممالک میں دولت کی اس غیر منصفانہ تقسیم کا علاج ضبطِ ولادت کی صورت میں سوچا گیا۔ وہاں کے مفکرین نے سب سے پہلے انسان کے ذہن میں اس باطل خیال کی آبیاری کی کہ قدرت انسانوں کے ساتھ ایک شرمناک کھیل کھیل رہی ہے۔ یعنی وہ جتنے زیادہ انسان پیدا کرنے کا سامان مہیا کرتی ہے اتنے اسبابِ رزق فراہم نہیں کرتی۔ اس نظریہ کی تائید کے لیے فوراً سائنس آگے بڑھی اور اُس نے زمین کے اندر قانونِ تقلیلِ حاصل کی فرمانروائی ثابت کر دی۔ خود سائنس کی ایجادات و انکشافات نے اس نظریہ کا جس طرح ابطال کیا ہے وہ ایک دوسری بحث ہے لیکن جدید انسان اسی نظریہ کو بنیاد قرار دے کر انسانی فلاح کی اگر کوئی صورت دیکھتا ہے تو وہ صرف ضبطِ تولید ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری تدبیر اُس کی نظر میں مؤثر اور مفید نہیں ہو سکتی۔

لیکن اس معاملے میں بھی وہ اپنے آپ پر کوئی پابندی عائد کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا وہ اس بات کے لیے برابر کوشاں رہا ہے کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے جس سے اُسے آزاد شہوت رانی کے مواقع بھی میسر رہیں اور وہ اولاد کی ذمہ داریوں سے بھی بچ جائے۔ چنانچہ سائنس ہی نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کی دستگیری کی اور اسے ایسی مصنوعی تدابیر سے آشنا کیا جن کو کام میں لا کر وہ بڑی آزادی کے ساتھ شہوانی لذت بھی حاصل کر سکتا ہے اور اولاد کے بوجھ سے بھی اپنے آپ کو مامون و محفوظ رکھ سکتا ہے۔

سائنس نے اس کی اس الجھن کو کسی حد تک سلجھا دیا ہے لیکن وہ اس کی زندگی کے تضاد کو دور نہیں کر سکی۔ اولاد والدین کے لیے بار اور لعنت نہیں ہوتی بلکہ نعمت اور رحمت ہوتی ہے۔ اولاد کی خواہش اور اس سے محبت انسان کی فطرت میں داخل ہے اور اس فطری جذبہ کی تسکین کا اگر جائز اور صحیح انتظام نہ کیا جائے تو پھر اس سے دوسری خباثتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ دیکھیے کہ یورپ کے لوگ نسلِ آدم کو تو ایک ناقابلِ برداشت بوجھ سمجھ کر اُسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے لیکن اولاد سے محبت کی اس فطری امنگ کو کتّے اور بلیاں پال کر پورا کرتے ہیں۔ یورپ کا انسان اس قدر صاحبِ نظر واقع ہوا ہے کہ اپنے لختِ جگر کے بوجھ کو اٹھانے سے تو وہ ہچکچاتا اور پس و پیش کرتا ہے لیکن کتّوں اور بلیوں کے بار کو بڑے ذوق و شوق سے قبول کر لیتا ہے۔ یہ ہے اس کی فکری بلندی کی انتہا۔

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب جنہیں انگلستان میں ایک لمبی مدت گزارنے کا موقع ملا ہے انہوں نے انگلستان میں کتّے کے معاشرتی مقام پر ایک نہایت ہی حقیقت پسندانہ مقالہ تحریر کیا ہے۔ ہم یہاں اُس کے چند اقتباسات درج کرتے ہیں جن سے اس بات کا آسانی کے ساتھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب کوئی قوم اپنی جبلّت کی تسکین کے لیے غیر فطری روش اختیار کرتی ہے تو اسے کس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

> "اب جو کھڑے کھڑے میں نے ذرا فرصت سے کمرے کو آنکھ اٹھا کر دیکھا تو ایک لاڈلے کتّے کا فوٹو چوکھٹے میں سجا ہوا دیوار پر آویزاں پایا۔ دوسری طرف ایک اور کتّے کی پینٹنگ بہار دے رہی تھی۔ یہ پینٹنگ مسز مائیلنڈ کی نقاشی کا اچھا نمونہ پیش کرتی تھی۔ اس معاینے کے بعد میں صوفے پر بیٹھنے کے لیے مڑا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں ایک مخملی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پوستین والا پلا بڑے مزے سے سو رہا ہے۔ میں نے اس کے آرام میں مخل ہونا مناسب نہ سمجھا اور آتش دان کے پاس ایک مسند نما نشست پر جا بیٹھا۔ اتنے میں لزلی ہائیلنڈ بتقاضائے مہمان نوازی نیچے کا کام سمیٹ کر مجھ سے باتیں کرنے کے لیے اوپر چلے آئے ظاہر ہے کہ لزلی ہائیلنڈ کو سوتے ہوئے پلے سے کوئی تکلف نہ تھا۔ انہوں نے آتے ہی اُسے اٹھایا اور اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ یہاں تک بھی خیریت تھی مگر جب انہوں نے کتے کو سینے سے لگائے اُس کا منہ بھی چوم لیا تو میں دل ہی دل میں پکار اٹھا یا للعجب!...

... میں ابھی اسی حیرت میں تھا کہ لزلی ہائیلنڈ کتے کو گود میں لیے صوفے پر آبیٹھے اور اپنے فہمیدہ اور پُرخلوص دوستانہ انداز میں مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ اس کے بعد ہر شام یہی صورت پیش آتی تھی۔ لزلی ہائیلنڈ اور میں آگ کے سامنے بیٹھ کر دیر تک اپنا دکھ سکھ ایک دوسرے سے کہتے۔ اس وقت کوئی نہ کوئی کتا میرے انگریز دوست کی گود میں ہوتا۔ وہ اسے تھپکتے، گلے لگاتے، اس کا منہ چومتے اور ساتھ ساتھ پوری سنجیدگی سے میری اور اپنی ذاتی زندگی کی آرزوؤں اور حسرتوں پر تبصرہ کرتے چلے جاتے۔ کتے اور انسان کا یہ پیار محض تفنن نہ تھا۔ دونوں طرف سے سچی محبت کا اظہار ہوتا تھا دونوں گلے ملتے، منہ چومتے، اور ناک سے ناک رگڑتے تھے۔ مسز ہائیلنڈ بھی اپنے کتوں سے اسی محبت کے ساتھ پیش آتی تھیں۔ کرسمس کی شام کو ہم سب آگ کے گرد بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اسی دوران میں مٹھائی کا ایک ڈبہ کھولا گیا۔ پہلے مسز ہائیلنڈ نے ایک ٹکڑا نکالا اور چکھا۔ اس وقت ایک کُتیا نے جو پاس بیٹھی تھی۔ بڑی تمنا سے مٹھائی کی طرف دیکھا۔ مسز ہائیلنڈ نے فوراً مٹھائی کا ایک لقمہ اس کے منہ میں دے دیا اور انگلیاں خود چاٹ لیں۔

مجھے دوران قیام میں معلوم ہوا کہ یہ سب بلیاں اور کتے ہائیلنڈ گھرانے کی اپنی ملکیت نہیں۔ گھر میں ان جانوروں کی کثرت کا ایک اور سبب تھا۔ اچھے طبقے کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انگریز جب بغرض سیر و سیاحت یا بوجہ ضرورت ملک سے باہر جاتے ہیں تو ذمہ دار والدین کی طرح اپنے پالک چوپایوں کے رہنے سہنے کے لیے کوئی شریف گھرانا تلاش کرتے ہیں اور ان کے قیام و طعام کے لیے معقول معاوضہ پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ جس طرح ہم اپنے بچوں کے لیے اتالیق کی ضرورت کا اشتہار دیتے ہیں۔ اسی طرح انگریزی اخبار کتوں کی خبرگیری کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً دونوں طرف کے ضرورت مندوں (یعنی کتوں کو چھوڑ کر جانے والوں اور اجرت پر خبرگیری کرنے والوں) کی طرف سے اشتہار شائع کرتے ہیں۔ مائیلنڈ گھرانے کے اکثر جانور اسی قسم کے اجرت دینے والے مہمان تھے۔ آپ کو شاید شبہ ہو کہ کتوں سے یہ سلوک و محبت مسٹر اور مسز مائیلنڈ کا کوئی خصوصی کمال تھا۔ لیکن آپ کا یہ حسنِ ظن انگلستان کی پوری آبادی سے ایک ظلم ہوگا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ایسا خیال ایک بین الاقوامی بے انصافی کا درجہ رکھیگا۔ میرے پاس اس دعوے کے کئی معقولی اور منقولی ثبوت، کئی عینی اور قرائنی شہادتیں ہیں کہ کتے اور انسان کا بھائی چارہ انگلستان کے مزاج میں راسخ ہو چکا ہے۔ اس میں امیر اور غریب یا عامی و فلسفی کے درمیان کسی قسم کی تمیز ناممکن ہے۔

پھر اس ضمن میں یہ چیز بھی ملحوظ خاطر رہے کہ انگلستان میں انسان اور کتے کی باہمی محبت کچھ بہت پرانی نہیں بلکہ صنعتی دور کی پیداوار ہے۔ اسی کے متعلق پروفیسر موصوف فرماتے ہیں:

"انگریزی لغت میں "کتا" کے مجازی مفہوم منجملہ اس لفظ کے دوسرے معانی کے دو ہیں۔ ایک مفہوم ہے "کمینہ اور ذلیل شخص"۔ یہ مفہوم بہت پرانا ہے اور دنیا کی اور زبانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ دوسرا مفہوم ہے "خوش باش آدمی"، "مزے کا آدمی"، "یار دوست"۔ دوسری صورت میں یہ لفظ انسان کے لیے پیار یا دل لگی سے استعمال ہوتا ہے۔ (جیسا اور کتے ہو)۔ یہ مفہوم نیا ہے اور نیو انگلش ڈکشنری بتاتی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ اس معنی میں "کتے" کا لفظ اہلِ انگلستان کی زبانوں پر سترھویں صدی کے شروع میں چڑھا۔۔۔

غالباً یہ امر محتاجِ ثبوت نہیں کہ کبھی انگریز بھی کتوں سے اسی طرح پر ہیز کرتے تھے جس طرح ہم لوگ آج تک کرتے ہیں۔ لیکن اس موضوع پر ایک تاریخی شہادت مجھے ایسی دستیاب ہوئی کہ اس کا ذکر یہاں شاید بر محل ہو گا۔ لندن سے بیس میل باہر سولھویں صدی کا بنا ہُوا ایک شاہی محل، جو "ہیٹ فیلڈ ہاؤس" کے نام سے موسوم ہے، اب بھی اپنی پرانی خوبصورتی اور شان کے ساتھ موجود ہے۔ میں اس محل کی سیر کو گیا تو مجھے ایک ایوان کے اندر لکڑی کے زینے کے سامنے دو چوبی کواڑ لگے ہوئے نظر آئے۔ اُن کی حقیقت دریافت کی، جواب ملا کہ پرانے زمانے میں انہیں "کتّا پھاٹک" کہتے تھے، اور ان کے لگانے سے غرض یہ تھی کہ جمہوریت کی ترقی سے پہلے انگلستان میں بھی کتّے کا شمار جانوروں میں ہوتا تھا"

فاضل مقالہ نگار نے آخر میں ان اسباب پر بھی بحث کی ہے جنہوں نے کتّے کو انگلستان کے جدید معاشرے میں اس قدر ارفع و اعلیٰ مقام عطا کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی تصریحات بڑے گہرے غور و فکر کی محتاج ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہمارے اپنے زمانے کے انگلستان میں بعض معاشی حالات نے کتّے کی اہمیت کو اور نمایاں کر دیا۔ بن بیاہے پن کی زندگی انگلستان کے مردوں اور عورتوں میں عام ہو گئی ہے اور اس سے انسان کی تنہا ماندگی کے احساس میں شدید اضافہ ہُوا۔ میں نے ٹائمز آف لندن میں ایک دفعہ یہ خبر دیکھی کہ ایک بڑھیا نے وصیت کی کہ موت پر میری لاش جلائی جائے اور میری راکھ میرے کتّے کی قبر میں دفن کی جائے۔ ایک اور بوڑھی عورت کا کتا یخ بستہ پانی میں ڈوب رہا تھا، عورت نے اسے بچانے کے لیے چھلانگ لگائی اور اپنی جان دے دی۔ بے اولاد اشخاص سے قطع نظر، انگلستان کے لوگ بالعموم کم اولاد ہیں۔ میرے پہلے لینڈ لارڈ مسٹر ہولٹ کا کوئی بچہ نہ تھا اور میری دو لینڈ لیڈیوں میں سے ہر ایک کی صرف ایک ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیٹی تھی۔ خواص کا بھی اس معاملے میں یہی حال نظر آیا مسٹر ہنری مارٹن، پروفیسر آربری، پروفیسر جونز، سب کی صرف ایک ایک صاحبزادی تھی اور کوئی ہائی سکول میں کوئی یونیورسٹی میں تھی، ظاہر ہے کہ ایسے گھروں میں ایک کتے کی موجودگی فی نفسہٖ ضروری ہے۔ انگلستان میں جو دوست میں نے بنائے اُن میں مسٹر اور مسز آرنلڈ بھی تھے۔ دونوں میاں بیوی نہایت شریف النفس، زندہ دل اور علم دوست تھے۔ ان کا کوئی بچہ نہ تھا مگر خدا نے ایک کتا دیا تھا جس سے گھر بھر میں ایک چہل پہل کا عالم رہتا تھا۔ مجھے ایک مرتبہ ٹریفالگر سکوئر (لندن) میں کرسمس کے زمانے کا ایک ہجوم دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں گھر گرہست لوگ بھی تھے۔ ایک کنبہ نظر آیا جس کے چار سال کے لڑکے نے ماں کی انگلی پکڑ رکھی تھی اور باپ نے دو ڈھائی سال کے بچے کو کندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ معاً میرے دل میں خیال آیا: "انہیں کتا پالنے کی ضرورت شاید پیش نہیں آئی! مجھے یقین ہے کہ اگر حالات کا رُخ وہی رہا جو گزشتہ تین صدیوں سے رہا ہے تو مستقبل کا انگلستانی "محمد حسین آزاد" "انگریزی کی پہلی کتاب" ان لفظوں سے شروع کرے گا:

"ماں کتے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ باپ ریڈیو سن رہا ہے اور کتا دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا ہے ......"

اقتباسات ذرا طویل ہو گئے ہیں لیکن فاضل پروفیسر صاحب نے جس خوبی اور دیدہ وری سے اہلِ انگلستان کی کتے کے ساتھ محبت اور اس کے وجوہ پر بحث کی ہے اُس کو دیکھنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ شفقت مادری اور پدری انسان کی کتنی فطری امنگ ہے اور اگر اسے پورا کرنے کا سامان موجود نہ ہو تو وہ اپنے اظہار کے لیے کس قسم کے غیر فطری طریقے اختیار کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔

پھر اس سلسلہ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ مندرجۂ بالا تصریحات کسی رجعت پسند اور ان پڑھ مُلا کے احساسات نہیں بلکہ ایک ایسے فاضل شخص کے تاثرات ہیں جس کی انگریزی تہذیب اور ادب پر نہایت گہری نظر ہے۔

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

© rasailojaraid.com